



<https://www.facebook.com/groups/372605677178945/>

زرد و ندبہ کا عطر * چوتھے منتخب کہانی

ہندوستان کے ممتاز فلم ساز، ہدایت کار، شاعر اور افسانہ نگار ملک سار کے فلم ہے
دوبہ کے ایسے گھر گھر کہانی۔ کاشی گزرتے وقت کے ساتھ یادیں بھی گزر جاتی ہیں

نفس

زندگی بھی زخمی چیتے کی طرح جست لگاتی دوڑتی ہے
اور جگہ جگہ اپنے بچوں کے نشان چھوڑتی جاتی ہے۔ ذرا ان نشانوں
کو تیسرے جواز کے دیکھیے تو کیسی عجیب تحریر بنتی ہے۔

چودھوی پچاسی کی بات ہے۔ کوئی ایک صاحب امرت سرے
اکثر خط لکھا کرتے تھے کہ میں ان کا "تقسیم" میں کھویا ہوا بھائی
ہوں۔ اقبال سنگھ ان کا نام تھا اور غالباً خالہ کالج میں پروفیسر
تھے۔ دو چار خط آنے کے بعد انھیں ایک مفصل جواب بھی دیا کہ
میں تقسیم کے دوران دلی میں تھا اور اپنے والدین کے ساتھ ہی
تھا اور میرا کوئی بھائی یا بہن ان فسادات میں گم نہیں ہوا لیکن اقبال سنگھ
اس کے باوجود اس بات پر یقین رکھتے رہے کہ میں ان کا گم شدہ بھائی ہوں
اور شاید اپنے بچپن کے واقعات سے ناواقف ہوں یا بھول چکا ہوں۔
ان کا خیال تھا کہ میں بہت چھوٹا تھا جب ایک قافلے کے ساتھ سفر
کرتے ہوئے گم ہو گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ جو لوگ مجھے بچا کر اپنے
ساتھ لے آئے تھے ان لوگوں نے مجھے بتایا نہیں یا میں ان
کا اتنا احسان مند ہوں کہ اب کوئی اور صورت حال مان لینے کے لیے
تیار نہیں۔ میں نے انھیں یہ بھی بتایا تھا کہ 1947 میں میں اتنا کم عمر بھی
نہیں تھا۔ قریب گیارہ برس کی میری عمر تھی لیکن اقبال سنگھ کسی صورت
ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ میں نے جواب دینا بند کر دیا۔ کچھ
عرصے بعد خط آنے بھی بند ہو گئے۔

ایک سال گزرا ہو گا کہ بمبئی کی ایک فلم کار سائی پرانجی
ایک پیغام ملا۔ کوئی برہمن سنگھ ہیں دلی میں مجھ سے بمبئی میں آکر
ملنا چاہتے ہیں۔ ملاقات کی وجہ سائی نے نہیں بتائی لیکن کچھ
پڑا اسرار قسم کے سوال کیے جن کی میں ان سے توقع نہیں
کرتا تھا۔ پوچھنے لگیں۔ "تقسیم کے دنوں میں تم کہاں تھے؟"
"دلی میں!" میں نے بتایا۔ "کیوں؟"
"یوں ہی۔"

سائی بہت خوب صورت اردو بولتی ہیں لیکن آگے اگر بڑی
میں پوچھا۔ "اور والدین تمہارے؟"

"دلی میں تھے۔ میں ساتھ ہی تھا ان کے۔ کیوں؟"
تھوڑی دیر بات کرتی رہیں لیکن مجھے لگ رہا تھا جیسے بات
انگریزی کا پردہ ڈال رہی ہیں کیوں کہ مجھ سے ہمیشہ وہی بات کہتی
تھیں جسے وہ ہندی کہتی ہیں۔ ہلّا خر پھوٹی پڑیں۔ "تو کھول کر بولنا
ہے کہ آئی ایم ناٹ سپوزڈ ٹو ٹیل یو لیکن دلی میں کوئی صاحب ہیں جو کہتے
ہیں کہ تم تقسیم میں کھوئے ہوئے فن کے بیٹے ہو۔"
یہ ایک نئی کہانی تھی۔

قریب ایک ماہ بعد اصول پالی کر: بمبئی کے مشیر لاکھ کا فن
آیا کہنے لگے۔ "میرا غلطوہ تم سے بات کرنا چاہتی بنی تھا ہے۔"
"میرا غلطوہ کون؟" میں نے پوچھا۔



شہرت سنکھہ اصل نام گل زار کے نام سے شہرت 118 اگست 1936ء
پیدا ہوا پاکستان میں پیدائش تقسیم ہند کے بعد دہلی میں سکونت پمل رائے کے
اسٹنٹ کے طور پر فلمی کیریئر کا آغاز رشی کپش مکھڑھی سے رہ نمائی پمل دا
کی "سنسنی" سے فلمی گانے لکھنے کی ابتدا ڈیگور کی کہانی پر معنی
فلم "کابلی والا" کے گانے "گنگا آئی کہاں سے" کے ذریعے شہرت گانوں میں
انفرادی شناخت کے بعد فلمی اسکرین اور کہانیوں کی طرف توجہ 1971ء میں
بظور ڈائریکٹر "میرے اپنے" کی ریلیزیوں فلم کے باذوق شائقین کے لیے شوخ
وسنجیدہ معرکہ آرا فلموں کا آغاز پھر چھوٹی اسکرین کے لیے بڑے کارنامے
موسیقی ہدایات مکالموں کردار نگاری اور پروڈکشن کے اعتبار سے یادگار
سلسلے وار قراصا "مرزا غالب" اور اردو کے مشہور افسانہ نگار پریم چند کی کہانیوں پر مشتمل ایک

سلسلہ "تحریر" منشی پریم چند کی۔ اب تک کوئی 60 فلموں کی کہانیاں 17 فلموں کی ہدایات ہر ایک اپنی
جگہ شاہ کار اور نمونہ فن 5 ڈیٹیشن اور 17 فلم فیئر اعزاز۔ ہندی سینما کے لیے ہمہ گیر خدمات کے اعتراف میں فلم
فیئر کی طرف سے 2002ء میں "حاصل حیات" لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ اور اسی سال بھارتی حکومت کی جانب
سے ہندویش کا قومی اعزاز مختصر کہانیوں کے مجموعے "دھواں" 2003ء میں سہتیہ اکیڈمی ایوارڈ

فنی دنیا کی بے پناہ مصروفیت کے باوجود اپنی پہلی محبت شاعری سے مسلسل ایک گونہ وابستگی
1962ء میں پہلے مجموعے "اک بوتچاٹ" اور حال ہی میں دوسرے مجموعے "ترویپنی" کی اشاعت رات اور چاند
کی کیفیتوں پر ایک اور شعری مجموعہ "رات چاند اور میں" "ادھر پاکستان میں" "رات پشیمانی کی" کی
اشاعت مختصر افسانوں کے بھی کئی مجموعے اردو زبان اور اردو تہذیب کے دل دادہ ایک
منیر ناستان گو فکر آفریں شاعر ممتاز فلم ساز کرشمہ کار ہدایت کار خیال انگیز نغمہ پرداز اور جانے کیا
کی تانہ روزگار گل زار

گل زار کے افسانوی مجموعے "دھواں" کے لیے احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں "افسانے کا یہی حسن ہے کہ
بات مختصر ہو اور دل میں اتر جائے۔ گل زار نے مختصر افسانوں کا یہ بھید پالیا ہے۔"
گیسی چنارنگ کی رائے میں "گل زار کہیں یک سرے نہیں ہونے ان کے یہاں زندگی کی سرگم ہے
اور ہر سرسری سے علیحدہ ہے۔"

اشفاق احمد کہتے ہیں "گل زار دراصل ایک افسانہ نگار نہیں کوزہ گرم ہے۔"
نور خود عالی جناب عزت مآب گل زار اپنے بارے میں کیا کہتے ہیں وہ کہتے ہیں "مجھے افسانوں کے دورے
پہنچتے تھے مگر ایک بات ہے نظم ہو یا افسانہ ان سے علاج نہیں ہوتا یہ انسانی دردوں کا علاج نہیں۔"
گل زار کی کئی کہانیاں آپ سب رنگ میں پڑھ چکے ہیں اب یہ کہانی ملاحظہ کیجیے یہ کہانی بھی ہے آپ بیتی بھی۔

تمسک دیکھو منتر آف منا کو منٹ مسرہ موڈ ڈوٹے کی جی۔
"وہ کیوں؟"
"ہاں نہیں لیکن وہ کس جت جیس کہیں پرفون کر سکتی ہے؟"
میرا کوئی سروکار نہیں تھا مسرہ یا مسرہ موڈ ڈوٹے سے۔ کبھی
میرا بھی نہیں تھا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ مول پالی کر کو میں نے دفتر
اور مرگ اوقات تادیے۔

افسانہ مل کھا ہوا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا یہ بھی اسی سائی
والے افسانے کی تری ہے لیکن مول پالی کر کیوں کہ ادا کار ہے وہ
اچھی اداکاری کر گیا اور مجھے اس کی وہ نہیں بتائی لیکن مجھے یقین
ہے کہ وہ اس وقت بھی وہ ضرور جانتا ہوگا۔

کچھ روز بعد پر ملا ڈوٹے کا فون آیا۔ انھوں نے بتایا کہ

سب رنگ

ہیں۔ ہاتھ کرنے والے ان کے بیٹے تھے۔ احسانا میں نے عرض کیا: "آپ انھیں زحمت نہ دیں۔ کل دوپہر آپ تشریف لائیں۔ میں آپ کے ساتھ چل کر ان کے دولت خانے پر مل لوں گا۔"

حیرت ہوئی یہ جان کر کہ سائی بھی وہاں تھی اصول پالی کر بھی وہاں تھے اور میرے اگلے روز اس پابکٹ منٹ کے بارے میں وہوں جانتے تھے۔

اگلے روز دوپہر جو صاحب مجھے لینے آئے وہ من کے بڑے بیٹے تھے۔ ان کا نام اقبال تھا۔ پنجابیوں کی عمر ہو جاتی ہے لیکن بوڑھے نہیں ہوتے۔ اٹھ کر بڑے پیار سے ملے۔ میں نے بیٹوں کی طرح ہی "میری پونا" کیا انھوں نے ماں سے ملاپا۔ "یہ تمھاری ماں ہے بیٹا!" ماں کو بھی "میری پونا" کیا۔ بیٹے انھیں وار جی کہہ کر بلاتے تھے۔ دوسرے بیٹے سویرے نچے۔ اچھا خاصا ایک پر پوار تھا۔ کافی کھلا بڑا گھر۔ یہ کھاپن بھی پنجابیوں کے رہن سہن ہی میں نہیں ان کے مزاج میں شامل ہے۔

علیک سیک کے بعد کچھ کھانے کو بھی آ گیا۔ پینے کو بھی آ گیا اور دار جی نے بتایا کہ مجھے کہاں کھویا تھا۔

"بڑے سخت دتے ہوئے بی! ہر طرف آگ ہی آگ تھی اور آگ میں جھنسی ہوئی خبریں پر ہم بھی نکلے ہی رہے۔ زمین دار مسلمان تھا اور ہمارے پتائی کا دوست تھا اور بڑا مہربان تھا ہم پر۔ اور سارا قصبہ جانتا تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے کوئی بے وقت ہمارے دروازے پر دستک نہیں دے سکتا۔ اس کا بیٹا اسکول میں میرے ساتھ پڑھتا تھا (شاید ایاز نام لیا تھا) لیکن جب پیچھے سے آنے والے قافلے ہمارے قصبے سے گزرتے تھے تو دل دہل جاتا تھا۔ اندر ہی اندر کانپ جاتے تھے ہم۔ زمین دار روز صبح شام مل کے جاتا تھا۔ حوصلہ دے کر جاتا تھا۔ میری چٹی کو بنی بنا کر کھا تھا اس نے۔

ایک روز وہاں آیا ایک قافلہ گزرا کہ ساری رات چھت کی منزل پر پہنچے گزری۔ ہمیں سارا قصبہ جاگ رہا تھا۔ لگتا تھا وہی آخری رات ہے۔ صبح پرلے (قیامت) آنے والی ہے۔ ہمارے پاؤں اکھڑ گئے۔ پتا نہیں کیوں لگا کہ بس یہی آخری قافلہ ہے اب نقل لو اس کے بعد کچھ نہیں بچے گا۔ اپنے محسن اپنے زمین دار سے دغا کر کے نکل آئے۔

وہ روز کہا کرتا تھا۔ "میری حویلی پر چلو میرے ساتھ رہو کچھ دن کے لیے تالا مار دو گھر کو۔ کوئی نہیں چھوئے گا۔"

لیکن ہم جھوٹ موت کا حوصلہ دھاتے رہے۔ اندر ہی اندر ڈرتے تھے۔ جی بتاؤں سپردن کا کا! ایمان مل گئے تھے۔ جزیں کا پینے

گئی تھیں۔ ہمارے قافلے ہی راستے سے گزر رہے تھے۔ ہاتھ والی سے ہو لے جوں میں داخل ہو جاؤ تو آگے نیچے جانے سے فوج کی ملک مل جانے کی۔ کھوپڑی کے نیچے ہی ملے ہوئے آئے۔ سچ تو یہ ہے کہ دل نے ہانک دی تھی اب ملن کی نفی ہو رہی وقت آ گیا کوچ کر چلاؤ۔ دلاڑ کے بڑے نایک چھوٹی لڑکی آنسووں کی اور سب سے چھو لے تم۔ دون کا سفر تھا میاں والی تک۔ چل چل پڑے۔ کھانے کو کچھ نہ تھا۔ جس گاؤں سے گزرتے۔ پتلا جاتا تھا۔ دنگے سب جگہ ہوئے تھے۔ ہو بھی رہے تھے لیکن۔ والوں کے لشکر ہمیشہ باہر ہی سے آتے تھے۔ میاں والی تک پہنچے پہنچے قافلہ بہت بڑا ہو گیا۔ کئی طرف سے لوگ آ آ کر جڑتے جاتے تھے۔ بڑی ڈھارس ہوتی تھی بیٹا! اپنے جیسے دوسرے بد حال لوگ کچھ کر۔ میاں والی ہم رات کو پہنچے۔ اسی سچ کئی بار بچوں کے ہاتھ چھتم سے۔ بدحواس ہو کر پکارنے لگتے تھے اور بھی تھے ہم جیسے ایک کبرام سا بچا رہتا تھا۔ پتا نہیں کیسے یہ خبر پھیل گئی کہ اس رات وہی والی پر حملہ ہونے والا ہے۔ مسلمانوں کا لشکر آ رہا ہے۔ خوف اٹھ رہا ایسا سنا کبھی نہیں سنا۔ رات کی رات ہی سب چل پڑے۔

دار جی کچھ دیر کو چپ ہو گئے۔ ان کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں لیکن ماں چپ کھنگلی باندھے مجھے دیکھ رہی تھی۔ کوئی اموشن نہیں تھا ان کے چہرے پر۔ دار جی بڑے دھیرے سے بولے۔ "بس ہی رات اس کوچ میں چھوٹے دونوں بچے ہم سے چھٹ گئے۔ پتا نہیں کیسے؟ پتا ہو تو....." وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر چپ ہو گئے۔

"مجھے بہت تفصیل سے یاد نہیں بیٹے۔" سویں کچھ اٹھنا کچھ جگہ بدل کے بیٹھ گئے۔ دار جی نے بتایا۔ "ہموں پہنچ کر بہت عرصہ انتظار کیا۔ ایک ایک کیپ جا کر ڈھونڈتے تھے اور آنے والے قافلے دیکھتے تھے۔ بے شمار لوگ تھے قافلوں کی شکل میں۔ کچھ پنجاب کی طرف چلے گئے کچھ نیچے اتر گئے جہاں جہاں جس کسی کے رشتے دار تھے۔ جب مایوس ہو گئے ہم تو پنجاب آ گئے۔ وہاں کے کیپ دیکھتے رہے۔ بس ایک تلاش ہی رہی۔ سچ گم ہو چکے تھے۔ امید چھوٹ چکی تھی۔ کوئی ہنس بائیں سال بعد ایک جتنا ہندوستان سے جا رہا تھا۔ گرد و دارہ پنجو صاحب کی یا تر کرنے۔ بس جی کر آیا جانے کے لیے۔ اپنا گھر دیکھنے کا بھی کئی بار خیال آیا تھا لیکن یہ بھلی مانس ہمیشہ اس خیال ہی سے نوٹ کے مذحال ہو جاتی تھی۔" انھوں نے اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور پھر یہ گلٹ بھی ہم سے چھنا نہیں کہ ہم نے اپنے قصبے کے زمین دار کا اعتبار نہیں کیا۔ سوچ کے ایک شرمندہ سب رنگ

آجائے پر کوئی آیا ہی نہیں۔ انھی کے گھر کو کرائی سی ہو گئی۔ کھانا کپڑا مٹا رہا پر بہت اچھی طرح رکھا انھوں نے۔ پھر بہت سال بعد شاید آٹھ نو سال بعد مالک نے مجھ سے نکاح پڑھ کر اپنی بیگم بنالیا۔ اللہ کے فضل سے دو بیٹے ہیں۔ ایک پاکستانی انٹرنورس میں ہے دوسرا کراچی میں اچھے عہدے پر نوکری کر رہا ہے۔

رائیٹرز کو کچھ کلیے قسم کے سوالوں کی عادت ہوتی ہے جس کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”وہ حیران نہیں ہوئی آپ کو دیکھ کر؟“

”نہیں۔ حیران تو ہوئی لیکن ایسی کوئی خاص متاثر نہیں ہوئی۔“ دارچی نے کہا۔

”اور سپورن؟ اس کے ساتھ نہیں تھا؟“

”نہیں اسے تو یاد بھی نہیں تھا۔“

ماں نے پھر وہی کہا جو ان باتوں کے درمیان دو تین بار کہہ چکی تھی۔ ”ہنی (سپورن) تو مان کیوں نہیں جاتا؟ کیوں چھپاتا ہے ہم سے؟ اپنا نام بھی چھپا رکھا ہے تو نے۔ جیسے سٹیڈل شاد ہو گئی تھے بھی کسی نے گل زار بتا دیا ہوگا۔“ تھوڑے سے وقفے کے بعد پھر بولی۔ ”گل زار کس نے نام دیا تھے؟ نام تو حیرا سپورن سنگھ ہے۔“

میں نے دارچی سے پوچھا۔ ”میری خبر کیسے ملی آپ کو؟ یا کیسے خیال آیا کہ میں آپ کا بیٹا ہوں؟“

”ایسا ہے پتھر او اہیکو رو کی کرنی۔ میں پینتیس سال بعد مٹی مل گئی تو امید بندھ گئی کہ شاید وہ سیکو رو بیٹے سے بھی ملا دے۔ اقبال نے ایک دن تمہارا انٹرویو پڑھا کسی پرچے میں اور بتایا تمہارا اصلی نام سپورن سنگھ ہے اور تمہاری پیدائش بھی اسی طرف کی ہے پاکستان کی تو اس نے تلاش شروع کر دی۔ ہاں میں نے یہ نہیں بتایا تمہیں کہ اس کا نام اقبال افضل چاچا کا دیا ہوا ہے۔“

ماں نے کہا۔ ”کا کا! تو جہاں مرضی ہے رو! تو مسلمان ہو گیا ہے تو کوئی بات نہیں پرمان تو لے تو ہی میرا بیٹا ہے ہنی۔“

میں اپنے خاندان کی ساری تفصیل دے کر ایک بار پھر ہر بھجن سنگھ جی کو نامید کر کے لوٹ آیا۔

اس بات کو آٹھ سال ہو گئے۔ اب سنہ 1993 ہے۔ اتنے برسوں بعد اقبال کی چٹھی ملی اور بھوک کا کارڈ ملا کہ سردار ہر بھجن سنگھ پر لوک سدھار گئے۔ ماں نے کہلوا دیا ہے کہ مہو نے کو ضرور خبر کر دیتا۔

مجھے لگا جیسے جی مچ میرے دارچی گزر گئے۔

کا احساس ہوتا تھا۔ بہر حال ہم نے جانے کا فیصلہ کر لیا اور جانے سے پہلے میں نے ایک خط لکھا زمین دار کے نام اور ان کے بیٹے ایاز کے نام بھی۔ اپنے کیے کی معافی بھی مانگی۔ اپنے ہجرت کے حالات بھی بتائے پر یار کے بھی اور دونوں کم شدہ بچوں کا ذکر بھی کیا۔ سٹیہ اور سپورن کا۔ خیال تھا شاید ایاز تو نہ پہچان سکے لیکن زمین دار افضل ہمیں نہیں بھول سکتا۔ خط میں نے پوسٹ نہیں کیا۔ سوچا وہیں جا کے کروں گا۔ میں پچیس دن کا دورہ ہے ملتا چاہے گا تو چاچا افضل ضرور جواب دے گا۔ بلوایا تو جائیں گے ورنہ۔۔۔ اب کیا فائدہ قبریں کھول کے؟ کیا ملتا ہے؟“

ایک لمبی سانس لے کر ہر بھجن سنگھ جی بولے۔ ”وہ خط میری جیب ہی میں پڑا رہا ہنی جی (سپورن) من مانا ہی نہیں۔ والہی میں کراچی سے ہو کر آیا اور جس دن لوٹ رہا تھا پتا نہیں کیا سوچھی کہ میں نے ڈاک میں ڈال دیا۔ نہ چاہے ہوئے بھی ایک انتظار رہا لیکن کچھ ماہ گزر گئے تو وہ بھی ختم ہو گیا۔ آٹھ سال کے بعد مجھے جواب آیا۔“

”افضل چاچا کا؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔ وہ چپ رہے۔

میں نے پھر پوچھا۔ ”ایاز کا؟“

سر کو ہلکی سی جنبش دے کر بولے۔ ”ہاں اسی خط کا جواب تھا۔ خط سے پتا چلا کہ تقسیم کے کچھ سال بعد ہی افضل چاچا کا انتقال ہو گیا تھا۔ سارا زمین دار ایاز ہی سنبھالا کرتا تھا۔ چند روز پہلے ہی ایاز کا انتقال ہوا تھا۔ اس کے کاغذ پتہ دیکھے جا رہے تھے تو

کسی ایک شخص کی جیب سے وہ خط نکلا۔ ماتم پرسی کے لیے آئے لوگوں میں کسی نے وہ خط پڑھ کر سنایا تو ایک شخص نے اطلاع دی کہ جس گم شدہ بڑی کا ذکر ہے اس خط میں دو ایاز کے انتقال پر ماتم پرسی کرنے آئی ہے میاں والی سے۔ اسے بلا کر پوچھا گیا تو

اس نے بتایا کہ اس کا اصلی نام سٹیہ ہے۔ وہ تقسیم میں اپنے ماں باپ سے چھڑ گئی تھی اور اب اس کا نام دل شاد ہے۔“

ماں کی آنکھیں اب بھی خشک تھیں لیکن دارچی کی آواز پھر سے بندھ گئی تھی۔ ”وہ سنگھ رو کا نام لیا اور اسی روز روانہ ہو گئے۔“

دل شاد وہیں ملی افضل چاچا کے گھر۔ لومنی اسے سب یاد تھا پر انا کھ یاد نہیں۔ ہم نے پوچھا وہ کھوئی کیسے؟ چھری کیسے ہم سے؟

تو یونی میں چل کر تھک گئی تھی۔ مجھے بہت فینڈا رہی تھی۔ ایک گھر کے آگن میں جھونکا تھا۔ میں اس کے پیچھے جا کے سو گئی تھی۔ جب اُٹھی تو کوئی بھی نہیں تھا۔ سارا دن ڈھونڈ کے پھر وہیں جا کے سو جاتی تھی۔ تین دن بعد اس گھر والے آئے تو انھوں نے

دنگا یا نیچے۔ میاں بنی تھی۔ پھر وہیں رکھ لیا کہ شاید کوئی ڈھونڈتا ہوا سب رات

